کنز الایمان
کی فنی حیثیت
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاجُ القرآن پبلیکیشنز
365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111
یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7237695
www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

جملہ حقوق بحق تحریکِ منہاج القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	: کنز الایمان کی فنی حیثیت
خطاب	: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	: رانا جاوید القادری
زیرِ اہتمام	: فریدِ ملّت ریسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk
مطبع	: منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعتِ اوّل تا چہارم	: (6,200)
اِشاعتِ پنجم	: نومبر 2004ء (1,100)
اِشاعتِ ششم	: ستمبر 2005ء (1,100)
اِشاعتِ ہفتم	: جون 2011ء
تعداد	: 1,200
قیمت	: -/35 روپے

ISBN : 969-32-0304-6

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز کی کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے تحریک منہاج القرآن کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاج القرآن پبلی کیشنز)

fmri@research.com.pk

مَولَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا
عَلٰی حَبِیبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ
مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ
وَالْفَرِیقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۴-۱/ ۸۰ پی آئی وی، مورّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ جنرل و ایم ۴/ ۹۷۰-۳-۷، مورّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷ این۔۱/ اے ڈی (لائبریری)، مورّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت/ اِنتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱/ ۹۲، مورّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

حرف آغاز

تاریخ اسلام کا وہ دور جب افق عالم سے عظیم الشان عثمانی خلافت کا سورج غروب ہو رہا تھا اور نادان ترک اپنے ہاتھوں سے قبائے خلافت چاک کر رہے تھے اس وقت باطل سامراجی طاقتیں مسلمانوں کو ملکی اور جغرافیائی سرحدوں کی نسبت علمی فکری اور اعتقادی محاذوں پر اس لئے زیادہ پسپا کرنا چاہتی تھیں تاکہ آئندہ یہ جنونی، مسلمان من حیث القوم کبھی نہ ابھر سکیں۔ انہوں نے طویل تاریخی تجربات کے بعد امت مسلمہ کو شکست فاش دینے کے لئے ایک ہی نسخہ تجویز کیا تھا اور وہ بقول اقبالؒ یہ تھا کہ

روح محمد اس کے بدن سے نکال دو

یہ کام اتنا آسان بھی نہ تھا۔ شکست خوردہ یہ قوم کم کوش اور پسپا سہی مگر عشق و محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آگ اس کے سینے میں موجود تھی جو کسی بھی وقت بھڑک کر خرمن باطل کو خاکستر کر سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے طویل منصوبے کو بتدریج آگے بڑھایا اور مسلمانوں کو قرآن و سنت کی تشریحات پر مبنی ایسا لٹریچر فراہم کیا جس میں محبت و عشق کی بجائے بالواسطہ تنقیص رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلو غالب تھا۔

چنانچہ "روح محمد" کو جسد ملت سے نکالنے کے لئے مغربی استعمار کی یہ متفقہ سازش جب نجدی پیمانوں میں رکھ کر پیش کی جانے لگی تو جہاں سادہ لوح مظلوم مسلمان اسے مرکز اسلام (حجاز) سے اٹھنے والی اصلاحی تحریک سمجھنے لگے وہاں برصغیر کے بعض جید علماء بھی اس فتنہ سے متاثر ہوئے جنہوں نے قرآن و حدیث کی ایسی تشریحات و تعبیرات شروع کر دیں جن سے مسلمان اپنے مرکز ایمان و ایقان نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی نسبت اختلافات کا شکار ہو گئے۔ عقائد و اعمال کی قدیم دیواروں میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں اور یوں برصغیر جیسی زرخیز دینی سرزمین کا ایک بڑا اور صحیح العقیدہ مسلمان طبقہ مذہبی انتشار کا شکار ہو گیا۔

یہ خطرناک فکری و اعتقادی سازش عالم اسلام کو "جمال مصطفوی" سے بیگانہ کر کے اسے عرب و عجم میں غیر موثر اور مردہ قوم کی صورت میں بدل کر اپنے منطقی نتیجہ کو پہنچ گئی۔ حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے بڑے درد و کرب میں ڈوب کر بڑے غور و فکر کے بعد قوم کی اسی حالت کو بیان کیا۔

عصرہا مارا زمان بیگانہ کرد
از جمال مصطفےؐ بیگانہ کرد

ان تمام حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی کی حیات و تعلیمات کو اس دور پر آشوب کے آئینے میں رکھ کر دیکھا جائے تو واضح ہو گا کہ آپ بلاشبہ برصغیر کی وہ منفرد اور ناقابل فراموش شخصیت ہیں جس نے بیک وقت علمی، عملی، فکری اور اعتقادی محاذوں پر پورے عزم و ہمت اور جوانمردی کے ساتھ تیغ بے نیام بن کر باطل نظریات کا مقابلہ کیا اور اس طوفان غارت گرایمان کے سامنے جرات و استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے۔ آپ نے بدعقیدگی کے اس مہلک مرض کے اثرات سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے اپنے نشتر قلم سے انتہائی کامیاب اپریشن کئے جن سے وقتی طور پر بعض عاقبت نا اندیش لوگوں کو درد و کرب کی ٹیسیں بھی اٹھیں۔

متعدد علوم و فنون پر مشتمل تقریباً" ایک ہزار تصانیف میں سے یوں تو ہر کتاب آپ کی ثقاہت و تبحر علمی کا ثبوت فراہم کرتی ہے مگر جس چیز نے آپ کے علم کو دوام بخشتے ہوئے آپ کے نام کو چار دانگ عالم میں زبان زد خاص و عام کر دیا وہ آپ کا ترجمہ قرآن ہے جو کنز الایمان کے نام سے مشہور ہے۔ کنزالایمان اگرچہ محض ترجمہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے عصر حاضر کی بڑی بڑی ضخیم تفاسیر سے زیادہ معیاری، واضح، مدلل، محقق، مقبول اور موثر ہے۔ اسی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر لوگوں نے تعصب یا غلط فہمی کی بناء پر بے بنیاد اعتراضات اٹھائے اور اس کی مقبولت کو کم کرنے کے لئے ملک اور بیرون ملک اس ترجمے پر پابندی لگوانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کے رد عمل کے طور پر بعض اہل درد علماء نے تقریر و تحریر سے جملہ شبہات کا بھرپور ازالہ کیا۔ یہ کتابچہ کنزالایمان کی فنی حیثیت، بھی دراصل علامہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے ایسے ہی ایک خطاب کی تحریری شکل ہے جو انہوں نے ساہیوال میں منعقدہ "کنزالایمان کانفرنس" میں فرمایا تھا۔

العارض:

علی اکبر قادری

خادم۔ علامہ فرید الدین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امتیازی خصوصیات

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاںؒ کے ترجمہء قرآن کا نام کنزالایمان ہے۔ کنزالایمان کا معنی ہے ایمان کا خزانہ کنزالایمان اور دیگر تراجم کا وقت نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد کوئی بھی غیر جانبدار قاری اس امر کا واشگاف الفاظ میں اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کنزالایمان تمام تراجم میں منفرد، ممتاز اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس امتیاز و انفرادیت کی متعدد وجوہات ہیں لیکن یہاں کنزالایمان کے امتیاز اور شرف و انفرادیت کے جن پہلوؤں کا ذکر کرنا مقصود ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اسلوب ترجمہ

۲۔ انداز بیان

۳۔ معنویت و مقصدیت

۴۔ صوتی حسن، سلاست ترنم اور نغمگی

۵۔ فہم و تدبر

۶۔ ادب الوہیت

۷۔ احترام رسالت

اسلوب ترجمہ

برصغیر پاک و ہند میں ترجمے کے بالعموم دو اسلوب مروج رہے ہیں۔ ایک اسلوب لفظی ترجمے کا ہے جبکہ دوسرا بامحاورہ ترجمے کا۔ لفظی ترجمہ اس ترجمے کو کہتے ہیں کہ ہر ہر لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ ہو۔ اس ترجمے میں عبارت کے تسلسل، روانی بیان اور ربط و نظم کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ چونکہ ہر لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ ہوتا ہے اس لئے پڑھنے والا قرآن پاک کے ہر ہر لفظ کے معنی سے تو باخبر ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اس ترجمے کو "مسلسل" عبارت سمجھ کر پڑھنا چاہتا ہے تو عبارت میں تسلسل، روانی بیان اور نظم و ضبط کے فقدان

کے باعث اسے تفہیم مطالب میں دقت پیش آتی ہے وہ کئی مقامات پر یہ محسوس کرتا ہے کہ نہ پہلی گفتگو کے ساتھ اس مقام کا کوئی ربط ہے اور نہ اگلی عبارت کے ساتھ کوئی تعلق۔ اس طرح قرآن کے حسن کلام اور اسلوب تخاطب کے بارے میں قاری کے ذہن میں جو تصور پہلے سے موجود ہوتا ہے لفظی ترجمے کے مطالعے کے بعد وہ قائم نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کے تراجم کو تاریخی تناظر میں دیکھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ترجمے کا آغاز اگرچہ "لفظی ترجمہ" سے ہوا لیکن اس اسلوب ترجمہ میں موجود مذکورہ سقم اور بیانی کمزوریوں کی بناء پر علماء نے بامحاورہ ترجمہ کی طرف زیادہ توجہ دی۔ لیکن بامحاورہ ترجمہ کرنے والوں نے بھی الاماشاء اللہ زیادہ تر زبان دانی کے جوہر دکھانے پر اکتفا کیا اور ان کی تمام تر کوششیں عبارت آرائی' انشاپردازی اور طرح طرح کے محاورات پر صرف ہونے لگیں جس سے نتیجتہ" توجہ فہم قرآن سے ہٹ کر زبان دانی پر مرکوز ہو گئی اور جس طرح لفظی ترجمہ پڑھنے والا بھی الفاظ و محاورات اور دور از کار تراکیب کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گیا' اس طرح قرآن حکیم کا حقیقی مفہوم نہ تو لفظی ترجمہ ادا کر سکا اور نہ ہی بامحاورہ۔ لفظی اور بامحاورہ ترجموں میں یہ بنیادی کمزوریاں تھیں جو تفہیم قرآن کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔

قرآن کا اسلوب بیان

قرآن کا اپنا اسلوب بیان نہ لفظی ہے اور نہ بامحاورہ۔ قرآن چونکہ کلام الٰہی ہے اس لئے اس کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔ حسن کلام روانیء بیان' شکوہ لفظی' اور مضامین میں ربط و ضبط قرآنی اسلوب بیان کی ایسی صفات ہیں جنہیں نہ تو لفظی ترجمہ اپنے اندر سمو سکتا ہے اور نہ ہی بامحاورہ ترجمہ۔

اعلیٰ حضرت کی انفرادیت

اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے کنزالایمان کے نام سے قرآن حکیم کا ایسا ترجمہ کیا ہے جو لفظی ترجمہ کے نقائص سے بھی مبرا ہے اور بامحاورہ ترجمہ کی کمزوریوں سے بھی پاک۔

اس ترجمے نے قرآنی عبارات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر حتی الوسع ہر لفظ کا معنی بھی سمجھ سکتا ہے اور قرآن کی حقیقی مراد اور مفہوم تک بھی

باآسانی رسائی پا لیتا ہے۔ کنزالایمان نہ تو قدیم اسلوب کے اعتبار سے محض لفظی ترجمہ ہے اور نہ ہی جدید اسلوب کے لحاظ سے فقط با محاورہ۔

کنزالایمان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے لفظی ترجمے کے محاسن کے حوالے سے قرآن کے ہر ہر لفظ کا مفہوم اس طرح واضح کر دیا ہے کہ اسے پڑھ لینے کے بعد کسی لغت کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہیں رہتی اور با محاورہ ترجمہ کے محاسن کو بھی اس خوبی و کمال کے ساتھ اپنے اندر سمو لیا ہے کہ عبارت میں کسی قسم کا بوجھ یا ثقل محسوس نہیں ہوتا۔

قرآن حکیم کی ایک آیت مبارکہ کے چند الفاظ ہیں۔

یعلمک من تاویل الاحادیث○

اس کا بامحاورہ ترجمہ بالعموم یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تجھے خوابوں کی تعبیر سکھا دے گا۔ اسی طرح لفظی ترجمہ کرنے والوں نے بھی تاویل الاحادیث کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ بات واضح نہیں ہوتی۔

اس طرح دونوں طرح کے تراجم سے لفظ تاویل کا معنی واضح نہ ہو سکا اور یہ پتہ نہ چل سکا کہ تاویل کہتے کسے ہیں۔ آیئے اب ذرا اعلیحضرت کے ترجمہ پر نظر ڈالیں۔ وہ اس مقام کا ترجمہ کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

اور (تیرا رب) تجھے باتوں کا انجام نکالنا سکھائے گا۔

اعلیٰ حضرتؒ نے احادیث کا ترجمہ "باتوں" کیا ہے۔ اس لئے کہ حدیث بات کو کہتے ہیں اسی طرح آپؒ نے تاویل کا معنی "انجام نکالنا" کیا۔ قرآن پاک کے ترجمہ کی پوری تاریخ میں یہ ترجمہ کہیں نظر نہیں آتا۔ تاویل کا معنی متعین کرنے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا یہ معنی فی الواقع عربی قواعد و ضوابط کی رو سے درست ہے۔ کتب لغت کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ لغت کی رو سے تاویل کا لفظ "اول" سے مشتق ہے اور "اول" کا معنی ہے **"رد الشی الی الغایه المرادة منه"** کسی چیز کا غایت مقصودہ یعنی انجام کی طرف لوٹ آنا۔

اسی کو تاویل کہتے ہیں۔ اسی سے مال ہے جس کا معنی انجام ہے۔ چنانچہ تاویل کا مطلب انجام نکالنا انجام سے باخبر ہونا۔ غایت سے آگاہ ہونا اور اس مقصود اصلی سے مطلع ہونا ہے جو کسی کلام کی تہہ میں مخفی ہو۔ علماء تفسیر و علمائے لغت نے اس کا یہی معنی متعین کیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرتؒ کا یہ ترجمہ کہ "وہ تجھے باتوں کا انجام نکالنا سکھا دے گا" قواعد عربی

کے عین مطابق ہے۔ مذکورہ ترجمہ لفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔ بامحاورہ اس طرح کہ اس میں لفظی ترجمے کا جھول باقی نہیں رہا۔ اس ترجمے سے نہ تو عبارت کی روانی متاثر ہوئی ہے اور نہ تسلسل ٹوٹا ہے۔ نہ کہیں عبارت میں سقم پیدا ہوا ہے اور نہ مضمون کا نظم مضحمل ہوا ہے۔ یوں اس ترجمے میں لفظی اور بامحاورہ ترجموں کا حسن کمال خوبی کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس ترجمے میں غیر ضروری عبارت آرائی سے گریز کے ساتھ ساتھ لفظ تاویل کا معنی تلاش کرنے کی حاجت بھی نہیں رہی۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

واذا خلوا عضوا علیکم الانامل من الغیظ قل موتوا بغیظکم ○ ۲۔

اعلیٰ حضرت نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے "اور اکیلے ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں غصہ سے تم فرما دو کہ مرجاؤ اپنی گھٹن میں"

اس آیت مبارکہ میں کفار کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کا بیان ہے اور خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس مقام پر حسن ترجمہ کے جس پہلو کی نشان دہی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "غیظ" دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے پہلے مقام پر غیظ کا معنی غصہ کیا ہے۔ اس لئے کہ غیظ عربی زبان میں شدید غصے کو کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

الغیظ ---- اشد غضب ا۔ غیظ شدید غصے کی حالت کا نام ہے۔

اسی آیت میں دوسرے مقام پر غیظ کا لفظ اس طرح استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

قل موتوا بغیظکم پیارے تم فرما دو کہ مرجاؤ اپنے غیظ کے باعث

دیگر مترجمین نے بلا استثناء دوسرے مقام پر بھی غیظ کا معنی غصہ ہی کیا ہے۔ کسی کا ذہن اس حقیقت کی جانب متوجہ نہ ہو سکا کہ پہلے مقام پر لفظ غیظ شدت غضب کی نشاندہی کر رہا ہے جبکہ دوسری جگہ یہی لفظ طبیعت کی اس گھٹن پر دلالت کر رہا ہے جو شدید غصے کی بناء پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت نے **موتوا بغیظکم** کا معنی کیا ہے "مرجاؤ اپنی گھٹن میں" مفردات کا مطالعہ کیا گیا تو اس میں غیظ کا ایک معنی تو شدت غضب ہی نظر آیا لیکن دوسرا معنی یہ بھی ملا کہ

امساک النفس عند اعتراء الغیظ ۲۔

یعنی جب غصہ شدت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے نتیجے میں طبیعت میں گھٹن پیدا ہو

جاتی ہے۔ اس حال میں کہ انسان نہ کچھ کر سکتا ہے اور نہ خاموش رہ سکتا ہے تو اس ذہنی و نفسیاتی کیفیت کو بھی غیظ ہی کہتے ہیں۔ لہٰذا پہلا غیظ سبب ہے جبکہ دوسرا اس کا نتیجہ۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اعلیٰ حضرتؒ نے پہلے مقام پر غیظ کا ترجمہ کیا کہ یہ سبب تھا اور دوسرے مقام پر غیظ کو نتیجے سے تعبیر کیا کہ یہ مسبب تھا۔

مترجمین کی پوری صف میں یہ شرف و کمال اور انفرادیت صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمے میں نظر آتا ہے کہ آپؒ نے ایک آیت میں استعمال ہونے والے ایک ہی لفظ کا دو مختلف مقامات پر اس طرح ترجمہ کیا کہ لغت کی باریکیوں کا لحاظ بھی تمام و کمال ملحوظ رہا اور آیت کا مفہوم بھی واضح ہو گیا۔

اسی طرح اس آیت میں ایک لفظ "**عضوا**" استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ بھی قابل توجہ ہے۔ تمام مترجمین نے "**عضوا علیکم الانامل**" کا معنی "وہ غصے سے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں"۔ کیا ہے حالانکہ اس کا معنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھانا نہیں بلکہ انگلیاں چبانا ہے۔ اعلیٰ حضرت وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے قرآن کے مقصد و مراد کو کمال خوبی کے ساتھ واضح کرتے ہوئے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے "اکیلے ہوں تو تم پر انگلیاں چبائیں" ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ حضرتؒ کے ترجمہ نے وہ شکوہ بھی دور کر دیا ہے جو لفظی ترجمے کے اسلوب سے پیدا ہوا تھا کہ اس سے لفظوں کے معانی تو سمجھ میں آ جاتے تھے لیکن عبارت کا ربط مضمحل ہو جاتا تھا اور وہ شکایت بھی دور کر دی جو محض با محاورہ ترجمے سے پیدا ہوتی تھی۔ اعلیٰ حضرت نے لفظی اور بامحاورہ ترجموں کے درمیان ایک راہ اعتدال مقرر کر دی جس سے نہ لفظی ترجمے کی انتہا پسندی باقی رہی اور نہ با محاورہ ترجمے کی بلامقصد لفاظی۔

انداز بیان

انداز بیان دو طرح کا ہو سکتا ہے یعنی تحریری یا تقریری۔ تقریری انداز سے مراد کسی تقریر یا خطاب کو من و عن اور لفظ بہ لفظ معرض تحریر میں لانا ہے اس اسلوب میں یہ قباحت ہے کہ اس میں ربط و تسلسل کا فقدان ہوتا ہے اسی لئے تقریروں کو ریکارڈ کر کے نقل کرنے کے بعد ان کی تہذیب و تبویب کی جاتی ہے۔ انہیں مرتب کیا جاتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تقریر کے انداز کو تحریری اسلوب میں بدل دیا جائے۔ تحریری انداز کی اپنی

انفرادیت ہوتی ہے اور تقریری انداز کی اپنی چاشنی، میرے خیال میں قرآن مجید نہ تو معروف معنوں میں تقریری انداز میں نازل ہوا ہے اور نہ ہی تحریری انداز میں، قرآن مجید کا خطاب بے شک کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور کبھی اہل مکہ سے۔ کبھی اہل مدینہ سے اور کبھی تمام عالم انسانیت سے اور یہ اسی طرح فرامین و ہدایات کا ایک مجموعہ ہے جس طرح ایک حاکم اپنے نائب کو مختلف معاملات میں وقتاً" فوقتاً" حکم جاری کرتا رہتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی رفتہ رفتہ ہدایات و فرامین بھیجے جا رہے تھے اور خطاب کے انداز میں گفتگو ہو رہی تھی لیکن اسے معروف معنوں میں تقریری انداز اس لئے قرار نہیں دیا جا سکتا کہ جو اسلوب فقط تقریری انداز بیان کا ہوتا ہے قرآن اس سے مبرا ہے۔ اسی طرح قرآن فقط تحریری انداز کے اسلوب سے بھی بالا ہے۔ کیونکہ قرآن احکامات و ہدایات کا چارٹر ہے۔

اس لئے قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ کبھی حاضر کے صیغے میں کلام کرتا ہے تو کبھی غائب و متکلم کے صیغے میں کبھی جمع کے صیغے لاتا ہے اور کبھی واحد کے۔ کبھی استدلال انداز اختیار کرتا ہے، کبھی وعظ و نصیحت کا اسلوب اپناتا ہے۔ کبھی امر کرتا ہے کبھی نہی۔ کبھی اس کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے اور کبھی نرم۔ اس اسلوب کو ہم نہ مطلقاً" تقریری کہہ سکتے ہیں نہ مطلقاً" تحریری۔ قرآن کا اپنا منفرد اور جداگانہ اسلوب ہے۔

ایک تلخ حقیقت

آزاد ترجمانی کرنے والے علماء نے قرآن کے انداز کو تقریری سمجھتے ہوئے اس کے معنی و مفہوم کو مربوط انداز میں بیان کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ اس کے ترجمے کو تحریری اسلوب میں بدلا جائے' تاکہ قاری جب ترجمہ پڑھے تو وہ تقریری انداز کے غیر مربوط پہلو سے مبرا ہو۔ لیکن یہاں معذرت کے ساتھ ایک تلخ حقیقت کا اظہار بھی بے محل نہ ہو گا کہ تقریری انداز کو تحریری انداز میں بدلنے کا تصور محض اس لئے پیدا ہوا کہ کلام الٰہی کو مخلوق کے کلام کے مماثل سمجھا گیا۔ قرآن خالق کائنات کا کلام ہے۔ جس طرح ذات باری تعالیٰ ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی ہر نقص و عیب سے مبرا ہے اس کا انداز تقریری ہو یا تحریری اس میں کسی قسم کے سقم یا کمزوری کا تصور بھی کفر ہے۔ دوسرا سبب تقریری انداز کو تحریر کے اسلوب میں بدلنے کا یہ ہوا کہ ایسا کرنے والے

علماء کے سامنے اعلیٰ حضرت" کا ترجمہ نہ تھا۔ انہوں نے دیگر تراجم پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ جب تک ترجمے کو تحریر کے باضابطہ اسلوب میں نہ بدلا جائے عبارت میں ربط و نظم کا فقدان ہی رہے گا۔ ان علماء کے پیش نظر صرف وہی تراجم تھے جو اپنے اسلوب میں قرآن کے مخصوص نظم کلام کو ملحوظ نہ رکھ سکے تھے۔ اگر ان حضرات نے اعلیٰ حضرت کے اسلوب ترجمہ کو بہ وقت نظر دیکھا ہوتا تو قرآن کے تقریری اسلوب کو ترجمہ کرتے ہوئے تحریری انداز میں بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

اہم نکتہ

یہاں ہم قارئین کی توجہ ایک انتہائی لطیف اور اہم نکتے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ بے شک رب العزت کا کلام اس کی عظمت و شوکت اور رفعت و سطوت کا آئینہ دار ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذات باری تعالیٰ اپنے بعض مقبول و مقرب بندوں کی ارواح کو اپنی صفاتی تجلیات کے فیضان سے منور بھی کیا کرتی ہے۔ خدا کا کلام بھی اس کی ایک صفت ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ وہ ذات اپنے کسی بندۂ خاص پر لطف و کرم کرتے ہوئے اس کے ترجمہ قرآن کو بھی اپنے کلام کی صفاتی تجلی سے اپنے کلام کی عظمتوں کا آئینہ دار بنا دے اور اس طرح جو حسن و کمال خود اس کے اپنے کلام میں جھلکتا ہے اسی کا ایک پرتو اس کے ترجمے میں بھی اتار دے۔ یہ حقیقت جب تک کسی کی نظر سے پوشیدہ رہتی ہے اسے تقریر کو تحریر کے انداز میں بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن جب اس کے عظیم کلام کی صفاتی تجلی کسی مرد حق کے باطن کو منور کر دیتی ہے تو اسے ترجمہ کرتے ہوئے ایسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطالعہ کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انہوں نے قرآن کے انداز کو کسی نئے اسلوب میں نہیں بدلا۔ جو اسلوب قرآن کا تھا اسے قائم رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ اسلوب نہ تو تقریری نوعیت کا ہے اور نہ ہی تحریری۔ بلکہ قرآن ہی کا اپنا اسلوب ہے۔ اگر ایک طرف قرآن کو پڑھا جائے اور دوسری طرف اعلیٰ حضرت کا ترجمہ سامنے رکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ ترجمہ کرنے والے کی روح پر اتر کر اپنے اپنے فیضان سے بہرہ ور کرتے ہوئے اپنا معنی و مفہوم مترجم کے ذہن پر منعکس کر رہا ہے۔

بعض چیزوں کا تعلق انسان کے ذوق لطیف کے ساتھ ہوتا ہے جس کے بغیر انسان

اس کی کنہ و حقیقت اور عظمت و رفعت کا ادراک نہیں کر سکتا۔ انداز بیان کے حوالے سے سورۂ لقمان کی یہ آیات ملاحظہ فرمایئے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ط اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ○ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ○ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ط اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ○

اب ذرا ذوق لطیف کے ساتھ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ پڑھیئے۔

"اے میرے بیٹے! نماز برپا رکھ اور اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے منع کر اور جو افتاد تجھ پر پڑے اس پر صبر کر' بے شک یہ ہمت کے کام ہیں' اور کسی سے بات کرنے میں اپنا رخسار کج نہ کر۔ اور زمین پر اتراتا نہ چل بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا' فخر کرتا' اور میانہ چال چل اور اپنی آواز پست کر۔ بے شک سب آوازوں میں بری آواز گدھے کی ہے"۔

ترجمے کا یہ اسلوب جو اعلیٰ حضرت نے اپنایا ہے بلاشک و شبہ تقریری ہے نہ تحریری بلکہ ان دونوں سے الگ ایک ایسا انداز ہے جس میں کلام الٰہی کے حسن و رعنائی کی جھلک بھی موجود ہے اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ اسلوب قرآن کی انفرادیت و چاشنی بھی۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ قرآن الفاظ قرآن کی توجہ اتحادی کے فیضان سے معمور ہے۔ جو حسن و خوبی' ربط و نظم اور روانیء بیان الفاظ قرآنی میں ہے ان کی جھلک اعلیٰ حضرت کے ترجمہ قرآن میں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی روح قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کی توجہ اتحادی کا محل بنی ہوئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے اور یہ بندے کا۔ جو حسن نظم قرآن میں ہے ترجمہ اس کا آئینہ دار ہے بیان کو جو زیروبم الفاظ قرآنی میں ہے اس کی جھلک ترجمے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ قرآن سامنے ہو تو پتہ چلتا ہے کہ جس طرح قرآن کا اپنا ایک اسلوب ہے جو نہ تقریری ہے نہ تحریری بلکہ ایک جداگانہ اور منفرد اسلوب ہے اسی طرح اس عظیم ترجمے کا بھی اپنا خاص اسلوب ہے جو نہ تقریری کہا جا سکتا ہے نہ تحریری اور جس طرح قرآنی اسلوب

بیان کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی اس طرح یہ ترجمہ بھی بے نظیر و بے مثال ہے۔

معنویت و مقصدیت

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ قرآن کا تیسرا امتیازی وصف معنویت و مقصدیت ہے۔ اگر کامل غیر جانبداری اور کسی قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر اعلیٰ حضرت کے ترجمے کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو مقصدیت و معنویت آیات قرآنی کا امتیاز ہے اس کی کامل جھلک اعلیٰ حضرت کے ترجمے میں بھی بخوبی موجود ہے۔

ترجمے میں معنویت کا پہلو

معنویت قرآنی کا اعلیحضرت نے کس قدر حسن و خوبی کے ساتھ ترجمے کی قالب میں ڈھالا ہے اس کی جھلک دیکھنے کے لئے سورۂ بقرہ کی افتتاحی آیت پر غور فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

الٓمّٓ ط ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ا ۛ

اعلیٰ حضرت نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے۔ "وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں"۔

اہل علم جانتے ہیں کہ **ذالک** اسم اشارہ بعید ہے جو دور کی اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے۔ قریب کی چیز کے لئے "ہذا" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن تو پڑھنے، سننے والے کے قریب ہے۔ دکھائی بھی دیتا ہے، پڑھا اور سنا بھی جاتا ہے لیکن یہاں اسم اشارہ قریب یعنی "**ھذا**" استعمال نہیں کیا بلکہ "**ذالک**" لایا گیا ہے۔ "**ذالک**" کے استعمال کی حکمت جاننے کے لئے آپ جتنے ترجمے چاہیں دیکھ لیں کسی ترجمے میں وہ معنویت و حکم دکھائی نہیں دیتی جو اسم اشارہ بعید کے استعمال کے مضمر ہے۔ یہ امتیاز صرف اعلیٰ حضرت کو حاصل ہے کہ انہوں نے کنزالایمان کے قالب میں اسم اشارہ بعید کے استعمال کی حکمت واضح کرکے رکھ دی ہے۔ "**ذالک الکتاب**" وہ بلند رتبہ کتاب کوئی شک کی جگہ نہیں..... ذہن میں خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ "بلند رتبہ کتاب" کے الفاظ کہاں سے آ گئے۔ حق یہ ہے کہ انہی میں **ذالک** کے استعمال کی حکمت پنہاں ہے۔

بسا اوقات ایک چیز اپنے حسی وجود کے اعتبار سے تو انسان کے قریب ہوتی ہے لیکن اپنی عظمت و سطوت اور شوکت و رفعت کے اعتبار سے اتنی ارفع اور بلند ہوتی ہے کہ اس

کی حقیقت تک رسائی انسانی فہم و ادراک سے بالا ہوتی ہے۔ قرآن حسی اعتبار سے تو ہمارے قریب ہے لیکن مقام و مرتبے کے اعتبار سے اتنا ارفع ہے کہ ساری انسانیت مل کر بھی اس کی مثل بنانے سے قاصر ہے قرآن وجود کے اعتبار سے بے شک ہمارے قریب ہے لیکن عظمت کے اعتبار سے اتنا بلند ہے کہ ذہن انسانی کی پرواز سے ماورا ہے لہٰذا قرآن کی عظمت و بزرگی اور رفعت و سطوت نے ظاہراً" نزدیک ہوتے ہوئے بھی اسے فہم انسانی سے دور بنا دیا ہے۔ اسی حکمت کے تحت اعلیٰ حضرت نے **"ذالک الکتاب"** کا ترجمہ "وہ بلند مرتبہ کتاب" کیا۔ یعنی وہ علو مرتبت کتاب جس کی حقیقت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نوعیت کی علمی حکمتیں جو بسا اوقات تفسیروں کے اوراق پڑھ لینے سے آشکار نہیں ہو پاتیں کنزالایمان کے مطالعہ سے فوراً" سامنے آ جاتی ہیں۔ فی الحقیقت کنزالایمان اتنا جامع' دقیع اور بھرپور ترجمہ ہے کہ انسان کو بیسیوں تفسیروں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

لاریب فیہ کا مفہوم

اسی طرح **لاریب فیہ** کا ترجمہ کرتے ہوئے اکثر مترجمین نے شک کی ماہیت کو متعین کر دیا ہے۔ مثلاً" یہ وہ کتاب ہے کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں وغیرہ وغیرہ۔ صاف ظاہر ہے شک ایک نوعیت کا نہیں کئی قسم کا ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے شک کی کسی نوعیت کو متعین نہیں کیا۔ **"لاریب فیہ"** میں تنکیر کی وجہ سے عمومیت و استغراق پایا جاتا ہے اس لئے **"لاریب فیہ"** کا معنی ہو گا کہ ذہن انسانی میں جو جو اور جس جس طرح کا شک بھی پیدا ہو سکتا ہے قرآن اس سے پاک ہے۔ قرآن حکیم میں شک کی نفی جتنے وسیع معنی پر دلالت کرتی اعلیٰ حضرت نے **"لاریب فیہ"** کا ترجمہ اسی معنوی وسعت سے کیا ہے۔

ترجمے میں مقصدیت کا پہلو

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصدیت کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ترجمہ قرآن میں مقصدیت کے پہلو سے مراد یہ ہے کہ قرآن کسی مقام پر جو خاص مضمون یا حقیقت بیان کرنا چاہتا ہے یا کسی واقعہ کے بیان سے جو خاص تاثر قائم کرنا چاہتا ہے ترجمہ کرتے ہوئے لفظوں کا انتخاب اتنی احتیاط سے کیا جائے اور ان کی ترتیب و ترکیب میں اس درجہ حزم ملحوظ رکھا جائے کہ جو تصور قرآن ذہن نشین کرانا چاہتا ہے وہ تصور بلا کم و کاست ترجمے کے قالب میں ڈھل کر قاری کے ذہن میں اتر جائے۔

ایک دلچسپ واقعہ

ترجمے میں مقصدیت کے بیان کے حوالے سے یہاں ایک واقعے کا بیان خالی از دلچسپی نہ ہو گا جو سپریم کورٹ کے شریعت بنچ میں پیش آیا۔ مجھے پچھلے دنوں عدالت مذکورہ میں ایک کیس کے سلسلے میں بغرض مشاورت بلایا گیا۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ اسلام میں تحدید ملکیت جائز ہے یا نہیں۔ ملک میں زرعی اصلاحات کے ذریعے جو تحدید ملکیت کا تصور دیا گیا ہے شرعاً" درست ہے یا غلط۔ دوران سماعت ایک فاضل وکیل نے زمین کی تحدید ملکیت کو ناجائز قرار دیتے ہوئے قرآن و سنت سے استدلال پیش کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سورہ الزخرف کی آیات نمبر ۳۲،۳۳ کا حوالہ دیا۔ جس سے وہ اس تصور کو واضح کرنا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو امیر اور کسی کو غریب بنایا ہے کسی کو ضرورت سے زیادہ دیا ہے اور کسی کو محض مفلس و نادار بنایا ہے یہ سب اللہ کی مشیت ہے۔ غربت و امارت کی یہ تقسیم خدا کی مشیت اور فطری نظام معیشت کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا خالق کائنات ہی نے جب یہ تفاوت اور درجہ بندی رکھی ہے تو کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ حق ملکیت کو محدود کر کے مشیت ایزدی کی خلاف ورزی کرے اس تصور کی توضیح کرتے ہوئے انہوں نے قرآن حکیم کی یہ آیت بطور استدلال پیش کی۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ○

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس مبارک گھرانے میں پیدا ہوئے وہ مالی اعتبار سے متمول اور زیادہ خوش حال نہیں تھا۔ اس گھرانے کے مقابلے میں قریش مال و دولت کی کثرت رکھتے تھے۔ وہ دنیا کی ہر قدر کو مال و دولت میں کثرت و قلت کے پیمانے پر پرکھنے کے عادی تھے اور یہ بات تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے کہ کوئی ایسا شخص بھی منصب نبوت پر فائز ہو سکتا ہے جو زیادہ اثر و رسوخ کا مالک اور مالدار و متمول نہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ منصب نبوت کسی دولت مند رئیس یا دنیوی جاہ و حشمت کے حامل انسان کو ملنا چاہئے تھا۔ ان کے اسی خانہ ساز معیار نبوت کی مذمت میں مذکورہ آیات نازل ہوئی۔

فاضل وکیل نے اس حصہ آیت "**وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا**

سخریا" کا ترجمہ یہ کیا' کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر مال و دولت کے اعتبار سے برتری عطا کی (یعنی کسی کو مال و دولت کی فراوانی عطا کی اور بعض کو دوسروں سے کم تر رکھا) تاکہ کچھ لوگ دوسروں کی ہمیشہ خدمت کرتے رہیں۔

وکیل موصوف نے غربت و امارت کے طبقاتی تصور کو مستقل طور پر قائم رکھنے کی تائید میں آیت مذکورہ سے استنباط کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خدا نے غریب کو غریب اس لئے رکھا ہے کہ وہ امیروں کی خدمت کرتے رہیں۔ وکیل موصوف نے اپنے استنباط کے ثبوت میں قرآن پاک کے متعدد تراجم پیش کئے جن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ غربت و امارت کا امتیاز اسی لئے رکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسروں کے کام آتے رہیں۔ جب فاضل وکیل مختلف تراجم کی روشنی میں اپنی تھیوری ESTABLISH کر چکے تو عدالت میری طرف متوجہ ہوئی اور ترجمے کی حقیقت کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے فاضل عدالت کو بتایا کہ میرے نزدیک لفظ "سخریا" کا معنی و مفہوم یکسر مختلف ہے۔ اور یہ لفظ یہاں خدمت و نوکری کے معنی میں نہیں بلکہ تمسخر و استہزاء کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور یہاں قرآن استفہامیہ انداز میں اس زعم باطل اور نخوت و تکبر کے بت کو پاش پاش کرنا چاہتا ہے جو کثرت دولت کے سبب امیروں میں پیدا ہو جاتا ہے۔

خطاب قرآن کے حکیمانہ پہلو پر نظر رکھنے والے اہل علم اس حقیقت سے بخوبی باخبر ہیں کہ اس مقام پر استفہام محذوف ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ قرآن کثرت دولت کے زعم میں مبتلا لوگوں کو یہ باور کرا رہا ہے کہ مال و دولت میں یہ تفاوت اس لئے نہیں رکھا گیا کہ تم اپنے سے کم تر لوگوں کا استہزاء کرتے پھرو۔

اس آیت میں درحقیقت غربت و امارت کی اس غیر فطری تقسیم کے نظام کو رد کیا جا رہا ہے۔ اور اسے کافرانہ تصور قرار دے کر مطعون کیا جا رہا ہے کہ غربت و امارت کے فرق کو اپنے معاملات کی حد تک تو رکھو لیکن اس تقسیم کو غریبوں کے مذاق کی بنیاد نہ بناؤ۔

عدالت نے مجھ سے لفظ "سخریا" کا معنی مذاق کرنے پر دلیل مانگی۔ میں نے اپنے موقف کے اثبات میں متعدد آیات قرآنی پیش کیں' اور عدالت کو بتایا کہ آیت مذکورہ کے پس منظر' سیاق و سباق اور جملہ قواعد عربی کی رو سے اس کا یہی ترجمہ درست ہے اس پر عدالت نے مجھ سے استفسار کیا کہ کیا کسی اور مترجم نے بھی آیت مذکورہ کا ترجمہ اسی طرح

کیا ہے؟ میں نے عدالت سے کہا کہ جس قدر تراجم عدالت میں موجود ہیں' انہیں باری باری دیکھا جائے مجھے یقین تھا کہ جو تصور رب العزت کے نظام معیشت کی عظمت پر دلالت کرتا ہے' اعلیٰ حضرت کا ترجمہ یقیناً" اس کے بیان پر مشتمل ہو گا۔ عدالت میں بیس پچیس کے قریب تراجم موجود تھے لیکن جو ترجمہ بھی دیکھا جاتا اس میں "سخریا" کا معنی خدمت ہی لکھا تھا۔ اتفاق سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ عدالت میں موجود نہ تھا۔ میں نے عدالت سے کہا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ منگوایا جائے۔ چنانچہ ترجمہ منگوا لیا گیا۔ اور اگلے دن جب عدالت کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو عدالت کے چیئرمین کے ہاتھ میں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تھا انہوں نے مجھے مبارک باد دی اور بتایا کہ اعلیٰ حضرت نے "سخریا" کا معنی مذاق ہی کیا ہے۔ میں نے رب العزت کا شکر ادا کیا اور اس طرف متوجہ ہوا کہ اگر اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ کیا ہے تو اس کی کوئی اصل بھی ضرور ہو گی میں نے تلاش کیا تو شیخ سعدیؒ کے فارسی ترجمہ میں بھی یہی مفہوم ملا۔ آگے بڑھا تو امام المفسرین امام قرطبیؒ نے بھی "سخریا" کا یہی معنی بیان کیا تھا۔ زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آ گئے کہ اعلیٰ حضرت! آپ کی وسعت نظر اور کمال فہم پر قربان جائیں کہاں کہاں تک آپ کی نظر بصیرت پہنچی ہے۔ ترجمہ قرآن میں مقصدیت کا یہ وہ پہلو ہے جو اسے دیگر تراجم سے منفرد و ممتاز کرتا ہے۔

صوتی حسن

اعجاز قرآن سے شغف رکھنے والے علماء اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ قرآن اسلوب بیان میں ایک اچھوتا صوتی حسن' منفرد نغمگی اور وجد آور صوتی سلاست ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے "الفوزالکبیر" میں قرآن کے صوتی ترنم اور سلاست نغمگی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جس طرح ایک آبشار گرتی ہے اور اس سے ساز فطرت کے تار چھڑتے ہیں یا کسی راہٹ کی آواز سے فضاؤں میں نغمگی بکھرتی ہے اس کا احساس و اندازہ کوئی صاحب ذوق ہی کر سکتا ہے۔ یہ مثالیں تو محض علامتی ہیں خدا کے کلام میں جو ترنم' صوتی حسن اور نغمگی و چاشنی ہے وہ ان استعاروں سے بالاتر ہے بلاریب ذوق لطیف کے ساتھ قرآنی آیات کو سننے والا جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ بیان قرآن کے اس اعجاز کو ترجمے میں سمونا بھی اعلیٰ حضرت ہی کا کام ہے۔ میں نے مختلف تراجم کا مطالعہ کیا ہے لیکن اعجاز قرآن کا یہ پہلو کہیں نظر نہ آیا۔ لیکن جب کنزالایمان پر نظر پڑی تو فرط جذبات سے

آنسو امڈ آئے اور عجیب رقت طاری ہو گئی۔ اور زبان پر بے اختیاز یہ الفاظ مچل گئے کہ اے اعلیٰ حضرت ! آپ پر رب العزت کا خاص لطف و کرم ہے کہ اس نے آپ کے ترجمے کو بھی اپنے کلام میں پائی جانے والے صوتی ترنم اور تغنم و نغمگی کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے سورۂ تکویر کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں اور پھر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ' آپ کا دل گواہی دے گا کہ الفاظ قرآنی میں جو صوتی حسن اور نغمگی و ترنم ہے اس کی جھلک اعلیٰ حضرت کے ترجمے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ وَ اِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ○

آیات مندرجہ میں کس قدر صوتی حسن اور ترنم و تغنم ہے اس کا اندازہ کوئی ذوق لطیف کا حامل انسان ہی کر سکتا ہے۔ اب ذرا اعلیحضرت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

"جب دھوپ لپٹی جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں' اور جب پہاڑ چلائے جائیں اور جب تھلکی اونٹنیاں چھوٹی پھریں اور جب وحشی جانور جمع کئے جائیں اور جب سمندر سلگائے جائیں اور جب جانوں کے جوڑ بنیں اور جب زندہ دبائی ہوئی سے پوچھا جائے کس خطا پر ماری گئی اور جب نامہ اعمال کھولے جائیں اور جب آسمان جگہ سے کھینچ لیا جائے اور جب جہنم بھڑکایا جائے اور جب جنت پاس لائی جائے۔"

اللہ اللہ کتنا ترنم' کتنا تغنم' کتنی نغمگی اور کتنی روانی ہے اعلیٰ حضرت کے ترجمے میں! ترجمہ قرآن میں قرآن کے صوتی حسن اور ترنم و نغمگی کا نظارہ کرنے کے لئے سورۂ النزعت کی درج ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ قُلُوْبٌ یَّوْمَىٕذٍ وَّاجِفَةٌ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ○

اب ذرا اعلیحضرت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

"قسم ان کی کہ سختی سے جان کھینچیں اور نرمی سے بند کھولیں اور آسانی سے پھر آگے

بڑھ کر جلد پہنچیں پھر کام کی تدبیر کریں کہ کافروں پر ضرور عذاب ہو گا جس دن تھرتھرائے گی تھرتھرانے والی۔ اس کے پیچھے آئے گی پیچھے آنے والی کتنے دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ آنکھ اوپر نہ اٹھا سکیں گے۔

سبحان اللہ! کیا ترجمہ پڑھتے وقت کیف و سرور اور ترنم و انبساط کا وہ عالم بدستور قائم نہیں رہا جو تلاوت کلام پاک سے نصیب ہوتا ہے؟۔

فہم و تدبر

کنز الایمان کا پانچوں امتیازی پہلو فہم و تدبر کا ہے۔ اہل علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ کتب لغت قرآن حکیم کے الفاظ کے معانی سمجھنے میں مدد دیتی ہے' ان سے مختلف الفاظ کے مادہ ہائے اشتقاق کا پتہ چلتا ہے اور ان کے اطلاقات کی خبر ملتی ہے کتب فقہ سے مسائل فقہ پر آگہی ملتی ہے اسی طرح کتب تفاسیر قرآن علوم و معارف اور اسرار و غوامض کا احاطہ کئے ہوتی ہیں۔ غرضیکہ انسان کو مختلف مسائل میں مختلف کتب سے رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کنز الایمان میں فہم و تدبر کا وہ عالم ہے کہ وہ علوم و معارف اور مطالب و معانی جو تفسیر کے ان گنت اوراق پر بکھرے پڑے ہیں کنز الایمان کے ایک ایک لفظ میں سمو دیئے گئے ہیں۔ وہ فقہی مسائل جن کے لئے بڑی بڑی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اعلیٰ حضرت کے ترجمے نے کمال اختصار کے ساتھ انہیں اپنے اندر سمو لیا ہے اسی طرح وہ لغوی مباحث اور مختلف اشتقاقات جن کے لئے لغت کی بیسیوں کتب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے کنز الایمان کا ایک ایک لفظ ان بحثوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کنز الایمان پڑھنے کے بعد نہ تو قاری کو متعلقہ مسائل میں کتب فقہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی لغت یا کتب تفسیر کی حاجت۔

ترجمے میں فہم و تدبر کے پہلو کا مشاہدہ کرنے کے لئے قرآن حکیم کی درج ذیل آیت ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایھا النبی انا ارسلنک شاھدا ۝

اس آیت میں دو لفظ لغوی اعتبار سے وضاحت طلب تھے ایک "نبی" اور دوسرا "شاہد" لفظ نبی کا اصطلاحی مفہوم بھی معروف و معلوم ہے اور لفظ شاہد کا اصطلاحی معنی بھی

عیاں ہے۔ یعنی نبی خدا کے فرستادہ پیغمبر کو کہتے ہیں اور شاہد گواہ کو کہتے لیکن نبی کو نبی کہتے کیوں ہیں لفظ نبی کا مادہ کیا ہے اور اس کے معنی کا اطلاق نبی پر کیونکر ہوتا ہے اسی طرح شاہد گواہ کہلاتا کس لئے ہے یہ تفصیلات وضاحت طلب تھیں۔

اعلیٰ حضرتؒ نے نبی کا معنی "اے غیب بتانے والے (نبی)" اور شاہد کا معنی "حاضرو ناظر" کیا ہے۔ آپ نے دونوں لفظوں کا ترجمہ اس انداز سے کیا کہ ان کی لغوی اعتبار سے وضاحت بھی ہو گئی اور اصطلاحی معنی بھی سمجھ آگیا۔ "نبی" کا معنی غیب بتانے والا نبی کرکے آپ نے وضاحت کر دی کہ نبی کو نبی کہا کس لئے جاتا ہے۔

یہ وضاحت کسی اور مترجم نے نہیں کی تھی اور کسی مترجم کا ذہن ترجمہ کرتے وقت بطور خاص اس لفظ کے لغوی پہلو کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ نبی "نبا" سے مشتق ہے جس کا معنی خبر ہے اور نبی فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے جس کا معنی ہے ہمیشہ خبر دینے والا خبر تو ڈیڈیو اور ٹیلی ویژن بھی دیتا ہے۔ اخبار اور رسالہ بھی دیتا ہے۔ ویسے بھی مختلف ذرائع سے خبریں انسان کو ملتی رہتی ہیں لیکن ان ذرائع پر لفظ نبی کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ جو خبریں نبی دیتا ہے وہ دیگر ذرائع نہیں دے سکتے۔ نبی عالم غیب کی خبر دیتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا۔

ذالک من انباء الغیب نوحیھا الیک ○

یہ غیب کی خبریں ہیں کہ ہم خفیہ طور پر تمہیں بتاتے ہیں۔

گویا نبی کو نبی کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس کے پاس غیب سے خبریں آتی ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ غیب کی خبریں دیتا ہے بلکہ فرمایا گیا۔

وما ھو علی الغیب بضنین یہ نبی غیب بتانے میں بخیل نہیں

یعنی اس رسول معظم سے جو حقیقت دریافت کی جاتی ہے بے نقاب کرکے رکھ دیتا ہے اور کبھی بخل سے کام نہیں لیتا بلکہ اس کا تو اعلان ہے کہ

سلونی عما شئتم پوچھ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔

غرضیکہ اس بارگاہ سے کسی کا سوال تشنہء جواب نہیں رہتا۔ چونکہ دونوں عالم کے غیب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آشکار تھے اس لئے فرمایا گیا۔

یا ایھا النبی اے غیب بتانے والے نبی

اسی طرح لفظ شاہد کا معنی عام طور پر گواہ کیا جاتا ہے۔ یہ معنی بھی درست ہے لیکن یہ

محض مرادی معنی ہے حقیقی نہیں۔ اس کا مصدر شہود ہے۔ امام راغب اصفہانی شہود کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الحضور مع المشاهدة اما بالبصرا و بالبصيرة ○ حاضر ہونا مشاہدہ کے ساتھ خواہ ظاہری آنکھ سے خواہ دل کی آنکھ سے

گویا شاہد کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جو بر بنائے مشاہدہ کسی مقام پر حاضر و موجود پایا جائے۔ مثلاً" ایک مقرر جو وجود کے اعتبار سے سٹیج پر حاضر ہوتا ہے لیکن مجمع کی آخری صف تک مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے اپنے مشاہدے کی بناء پر وہاں تک حکماً" حاضر تصور کیا جائے گا اور ایک نابینا شخص جو کسی واقعے کو دیکھ نہیں رہا جسمانی طور پر حاضر و موجود ہونے کے باوجود حکماً" غیر حاضر ہی تصور ہو گا اس کے برعکس اگر کوئی شخص موجود تو بے شک کچھ فاصلے پر ہو لیکن واقعے کا مشاہدہ کر رہا ہو تو جہاں جہاں تک وہ ناظر ہو گا وہاں وہاں تک حکماً" حاضر بھی مانا جائے گا۔

محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم وجوداً" بے شک گنبد خضرئ میں تشریف فرما ہیں لیکن مشاہدہ پوری کائنات کا فرما رہے ہیں لہٰذا جہاں جہاں تک آپ ناظر ہیں وہاں وہاں آپ حاضر بھی ہیں اسی لئے تو قرآن نے "**انا ارسلنک شاهدا**"" کہا کہ پوری کائنات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر مشاہدہ و مطالعہ ہے۔

فہم و تدبر کی ایک اور مثال

قرآن پاک میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

فلا تدع مع الله الها اخر

اعلیٰ حضرت نے اس کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے "تو اللہ کے سوا کسی کو نہ پوج" اسی طرح **ان الذین یدعون من دون الله** کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے "جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور کو پوجتے ہیں" کیا ہے۔ **دعا یدعو** عربی زبان میں لفظ مشترک ہے جس کا معنی عبادت بھی ہے اور پکارنا بھی، لیکن اعلیٰ حضرت نے ہر دو مقامات پر ترجمہ "عبادت کرنا" کیا ہے۔ اہل علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ عربی زبان میں بعض الفاظ مشترک کہلاتے ہیں۔ ایسے الفاظ کو موؤل معنی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ایک لفظ کثیر المعانی ہو تو علم و دیانت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ سیاق و سباق کی روشنی میں ایسے معنی کا انتخاب کیا جائے جو فی

الحقیقت اس مقام پر مطلوب ہو، اسے معنی مرادی بھی کہا جاتا ہے۔ لفظ صلوٰۃ کے چھپن (۵۶) معانی ہیں لیکن ان سب معنوں کو چھوڑ کر ہم صلوٰۃ کا وہی معنی مراد لیتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اس طرح دعا یدعو کا معنی بلانا اور پکارنا بھی ہے اور عبادت کرنا بھی۔ تاہم اعلیٰ حضرت نے اس کا معنی عبادت کیا ہے۔ اور آپ کا یہ معنی مراد لینا آپ کے فقہی تبحر، علمی تفحص اور کمال درجہ فہم و تدبر کا آئینہ دار ہے۔ امام جلال الدین سیوطی، امام رازی، امام خازن، امام صاوی اور صاحب تفسیر ابو مسعود ایسے مفسرین نے "الذین یدعون من دون اللہ" کا یہی ترجمہ کیا ہے کہ "جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے ہیں (وہ مشرک ہیں) محض کسی کو پکارنے والے کو مشرک نہیں کہا گیا بلکہ ماسوا اللہ کی عبادت کرنے والوں کو مشرک کہا گیا ہے۔

جب سے دعا یدعو کا معنی پکارنا کیا جانے لگا اور ترجمہ اپنے محل سے ہٹنے لگا۔ امت مسلمہ میں تفرقہ و انتشار کا دروازہ کھل گیا۔ مختلف مکاتب فکر وجود میں آنے لگے۔ بحثیں ہونے لگیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنا جائز ہے نہیں کیا اللہ کے مقرب اور محبوب بندوں کو پکارا جا سکتا ہے یا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس نوعیت کی بحثیں اس وقت تک شروع نہ ہوئی تھیں جب تک کہ "دعا یدعو" کا معنی پکارنا نہیں کیا گیا تھا۔ جب سے بعض اہل علم نے اسلاف کی راہ سے ہٹ کر اس کا معنی "پکارنا" کرنا شروع کیا انتشار و افتراق کی راہیں کھل گئیں۔ نتیجتہ" امت کا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنا تعلق غلامی بھی مضمحل ہونے لگا۔ اعلیٰ حضرت" کا ترجمہ امت مسلمہ میں وحدت کا آئینہ دار تھا لیکن اس ترجمے سے انحراف نے ملت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا۔

فہم قرآنی کی ایک جھلک

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر حرام چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

حرمت علیکم المیتہ والدم و لحم الخنزیر و ما اھل بہ لغیر اللہ ○

اعلیٰ حضرت نے اس کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے۔

"تم پر حرام ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جس کے ذبح میں غیر خدا کا

نام پکارا گیا"

اعلیٰ حضرت نے **وما اھل بہ لغیر اللہ** کا ترجمہ "جس پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے" کیا ہے۔ لفظ **اھل** اہلال سے ہے جس کا معنی ہے "**رفع الصوت عند الذبح**" یعنی ذبح کے وقت آواز بلند کرنا۔ اعلیٰ حضرت نے اسی مناسبت سے "**وما اھل بہ**" کا ترجمہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارنا کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمے کی سند پر اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ شاہد عادل ہے۔ ہر مفسر یہی ترجمہ کرتا چلا آیا ہے۔ اگر تفسیروں کے نام گنوائے جائیں تو ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ آپ کسی بھی قدیم تفسیر کو اٹھالیں یہی ترجمہ بلا استثناء ملے گا۔ خلاصۃ" اتنی بات ذہن نشین کر لیں کہ پوری تاریخ میں ائمہ تفسیر، ائمہ حدیث، ائمہ فقہ اور ائمہ لغت و ادب نے **اھل بہ** کا وہی ترجمہ کیا ہے جو اعلیٰ حضرت نے کیا ہے۔ یہ انتہائی تلخ اور افسوسناک حقیقت ہے کہ دور مابعد کے بعض مفسرین نے متفقہ و مسلمہ معنی سے انحراف کرتے ہوئے اس کا معنی کچھ اس طرح کر دیا کہ "ہر وہ جانور اور کوئی بھی چیز جو غیر اللہ کے نام سے منسوب کر دی جائے حرام ہے" اہلال کا معنی "غیر اللہ کے نام سے منسوب کرنا نہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان سے ثابت ہے نہ کسی لغت میں اس کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی ائمہ تفسیر میں سے کسی نے یہ معنی بیان کیا ہے۔

لفظ اھل کی علمی تحقیق

عربی زبان میں پہلی رات کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔ اہل عرب کا یہ طریقہ تھا کہ جب پہلی تاریخ کا چاند نمودار ہونے کا وقت آتا تو اس کے طلوع کا انتظار کرتے اور جب چاند نظر آجاتا تو چلا کر کہتے کہ چاند نظر آگیا۔ اس طرح پہلی رات کا چاند دیکھنے پر "وہ چاند نکل آیا" کی جو آواز بلند کی جاتی تھی اسے ہلال کی نسبت اہلال کہا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ خاص خاص مواقع پر پیدا ہونے والی آواز پر بھی (ہلال) کا اطلاق ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ منتظر رہتے کہ بچہ چیخے یا روئے تاکہ پتہ چل سکے کہ زندہ ہے یا مردہ اور جب بچہ تولد کے بعد رونے یا چیخنے کی صورت میں پہلی آواز نکالتا تو کہتے "**اھل الصبی**"۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ بچے کے تولد پر اس کی پہلی آواز پر بھی لفظ اہلال کا اطلاق کیا جانے لگا۔ عرب جب جانور ذبح کرنے لگتے تو وقت ذبح اس پر بتوں کا نام پکارتے۔ کوئی لات پکارتا کوئی منات اور کوئی عزیٰ کا۔ چنانچہ جانور ذبح کرتے وقت بھی ہر طرح کی پکار پر ہلال کے

لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ظہور اسلام کے بعد ایک حدیث مبارکہ کی رو سے اہلال مطلق ذبح کے لئے مختص ہو گیا۔

اس پس منظر اور لفظ اہلال کے مختلف اطلاقات کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اعلیٰ حضرت نے **"وما اھل بہ لغیر اللہ"** کا جو معنی کیا ہے کمال درجہ فہم و تدبر کا آئینہ دار ہے ۔ چنانچہ اگر ذبح کے وقت جانور پر صرف اللہ کا نام پکارا جائے باوجودیکہ ذبح سے پہلے یا بعد میں ایصال ثواب کے لئے کسی اور کی طرف منسوب کر بھی دیا گیا ہو تو یہ ہر گز اہلال نہیں ہو گا۔ جب تک **"اھل"** کا یہی ترجمہ مراد لیا جاتا رہا ملت تفرقہ و انتشار سے محفوظ رہی لیکن جب سے اس متفقہ و مسلمہ ترجمے کا انحراف کر کے دیگر معانی مراد لئے جانے لگے ملت کا اتحاد پارہ پارہ ہونے لگا اور وہ فرقہ بندیوں کی فسوں کاریوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔

۶ ـ ادب الوہیت

کنز الایمان دیگر مختلف النوع فنی محاسن کے ساتھ ساتھ کمال درجہ ادب الوہیت کا بھی آئینہ دار ہے۔

قرآن حکیم میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

ان المنافقین یخدعون اللہ وھو خادعھم○

اس مقام کا ترجمہ بالعموم مفسرین و مترجمین یہ کرتے ہیں کہ "بے شک منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اللہ ان کو دھوکہ دینے والا ہے" (معاذ اللہ استغفر اللہ)۔ آپ جو ترجمہ چاہیں اٹھا کر دیکھ لیں اکثر مفسرین شان الوہیت کی نزاکت سے بے خبر یہی ترجمہ کرتے نظر آئیں گے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی آیت میں لفظ خدع منافقین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور اللہ رب العزت کے لئے بھی۔ چنانچہ مترجمین نے ہر دو مقامات پر ایک ہی معنی مراد لے لیا ہے لیکن اللہ رب العزت جسے فہم قرآن کا نور عطا فرما دیتا ہے اس پر اسرار قرآنی کے ساتھ ساتھ معارف ادب بھی آشکار ہو جاتے ہیں اور وہ اس نوعیت کی علمی لغزش سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے اس مقام کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے "بے شک منافقین اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اپنے گمان میں اور وہ ان کی تدبیر کو ناکام کر دے گا"۔

فرق ملاحظہ فرمایئے دیگر مترجمین نے ترجمہ کیا "منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں" اعلیٰ

حضرت نے ترجمہ کیا "منافق اپنے گمان میں اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں"۔ اسی طرح "وھو خادعھم" کا ترجمہ کرتے ہوئے آپ نے دھوکے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی کہ یہ شان الوہیت کے منافی تھا۔ آپ نے ترجمہ کیا "وہ ان کی تدبیر کو ناکام کر دے گا انہیں غافل کرکے مارے گا" یہ ترجمہ پڑھتے ہی میری نگاہ لغت عرب اور کتب ادب کی طرف بے محابا اٹھ گئی میں نے قرآن کے دیگر مقامات کا جائزہ بھی لیا تاکہ دیکھا جائے کہ اس ترجمے کی کوئی اساس عربی ادب میں اور خود قرآن میں کسی دیگر مقام پر بھی موجود ہے کہ نہیں۔ لغت، ادب و فن اور قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ قرآن بسا اوقات ایک ہی لفظ ایک جملے میں کبھی فعل کے لئے استعمال کرتا ہے اور کبھی جزائے فعل کے لئے یعنی لفظ تو ایک ہی ہوتا ہے ایک مقام پر اس سے مراد فعل لیا جاتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کی سزا۔ چنانچہ فعل ناپسندیدہ و مردود ہو تو اس پر مترتب ہونے والی سزا کے لئے بھی بسا اوقات وہی لفظ استعمال کر دیا جاتا ہے جیساکہ قرآن حکیم میں جزاء سیئتہ سیئتہ مثلھا۔ اس مقام پر لفظ سیئتہ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ پہلے مقام پر اس سے مراد برائی ہے جبکہ دوسرے مقام پر اس برائی کی سزا۔ اسی طرح آیت مذکورہ میں "خدع" کا لفظ ایک مرتبہ فعل کے معنوں میں استعمال ہوا جس کی نسبت منافقین کی طرف کی گئی اور دوسری مرتبہ یہی لفظ اللہ کی طرف سے منافقین کے عمل پر مترتب ہونے والی سزا کے لئے استعمال کیا گیا۔ چنانچہ یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ منافق جو اپنے تئیں رب العزت کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں ان کے اس عمل قبیح کی پاداش میں رب العزت انہیں بے خبر رکھ کر مارے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت نے جو یہ ترجمہ کیا ہے کہ منافق اللہ کو اپنے گمان میں دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو یہ ترجمہ انہوں نے کس بناء پر کر دیا۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی کب یہ مجال ہے کہ وہ رب العزت کو دھوکہ دے سکے۔ اس کی ذات اس نوعیت کی فسوں کاریوں سے ماوراء ہے۔ چنانچہ یہ ترجمہ کہ "منافقین اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں" شان الوہیت کے منافی تھا۔ ادب الوہیت کا تقاضا یہ تھا کہ ترجمہ اسی انداز سے کیا جائے جس طرح اعلیٰ حضرت نے کیا ہے یعنی "وہ اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں" چنانچہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ کنز الایمان دیگر فنی محاسن کے ساتھ ساتھ کمال درجہ ادب الوہیت کا بھی آئینہ دار ہے۔

چنانچہ "وھو خادعھم" کے ترجمے یعنی وہ غفلت کی نیند سلا کر انہیں دھوکہ دہی کی

سزا دے گا اس میں ذات الوہیت کا ادب بھی بدرجہ کمال ملحوظ رکھا اور اس حصہء آیت کا ترجمہ بھی نکھر کر واضح ہو گیا۔

۷۔ ادبِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کنز الایمان میں ادب رسالت کا پہلو تو جداگانہ اور امتیازی شان کے ساتھ جلوہ گر ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ آپ کی ساری زندگی عشق و ادب مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور پاس ادب سے نابلد لوگوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں بسر ہوئی۔

رب العزت نے ایک مقام پر اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ○

اس مقام کا ترجمہ اہل علم کے لئے ایک آزمائش سے کم درجہ نہیں رکھتا تھا۔ اکثر مترجمین نے اس کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے۔ اللہ نے آپ کو بھٹکا ہوا "راہ حق سے بے خبر اور گم کردہ راہ پایا تو ہدایت کی راہ دکھائی"۔

یہ تراجم بلاشک و شبہ شان رسالت اور ادب بارگہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے منافی تھے۔ مترجمین کے ہاتھ سے بوجوہ ادب رسالت کا دامن چھوٹ گیا تھا اور وہ اس حقیقت سے صرف نظر کر بیٹھے کہ اللہ کا کلام جو اترا ہے **"ورفعنالک ذکرک"** کا مصداق بن کر ہے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت **"وانک لتھدی الی صراط مستقیم"** (اے محبوب بے شک تو سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے) کا دعویٰ کرتا ہے تو ایسے معظم و اعلیٰ مرتبت رسول کی نسبت یہ کہنا کہ وہ معاذ اللہ راہ حق سے بھٹکا ہوا' بے خبر یا گم کردہ راہ تھا کتنا بڑا ظلم ہے۔ جس کا اپنا یہ عالم ہو کہ وہ راہ صواب سے بھٹکا ہوا ہو کس طرح دوسروں کو ہدایت کی دولت سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ضال کا ایک معنی گمراہ بھی ہے لیکن اس کی نسبت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے کا تصور بھی منافی ایمان ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اس نازک مقام کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا۔

"اے پیارے ہم نے تجھے اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو تجھے اپنی طرف راہ دی"۔

امام صاوی' امام رازی' امام اصفہانی' علامہ خازن دیگر متعدد مفسرین اور علمائے لغت نے

بھی ضال کا معنی کسی کے عشق و محبت اور شوق ملاقات میں یوں خود رفتہ ہو جانا کہ اپنی بھی خبر نہ رہے' ہی بیان کیا ہے اور یہ معنی خود قرآن سے ثابت ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو اپنے فرزند حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت و فرقت میں رو رو کر اپنی بینائی گنوا بیٹھے تھے ایک روز جب اپنے بیٹوں کو مخاطب کرکے یہ کہا کہ مجھے اپنے بیٹے یوسف کی بو آ رہی ہے تو وہ کہنے لگے۔

انک لفی ضلالک القدیم بے شک آپ اپنی اس پرانی خود رفتگی میں ہیں۔

اس قرآن مثال کے ذریعے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن حکیم میں بھی یہ لفظ خود رفتگی اور استغراق محبت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں۔

اشارۃ الی شغفہ یوسف و شوقہ الیہ○

ضلال سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام سے محبت اور ان کا شوق مراد ہے۔

امام راغب اصفہانی اس پر قرآن پاک سے تائید پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زلیخا کو طعنہ دیتے ہوئے مصر کی عورتوں نے کہا تھا۔

قد شغفھا حبا انالنرٰھا فی ضلال مبین○

اس کا دل یوسفؑ کی محبت سے لبریز ہے اور ہم اسے اس کی محبت اور شوق میں ہی دبی ہوئی پاتی ہے۔

بے شک ضلال میں بے خبری کا معنی پایا جاتا ہے اور بے خبر ہونا ضلال کا تقاضا بھی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز سے بے خبری۔ کسی نے اس بے خبری کو راہ شریعت سے بے خبری پر معمول کیا' کسی نے راہ ہدایت سے بے خبری پر اور کسی نے راہ حق سے ...م آگہی پر لیکن اعلیٰ حضرت نے اسے وفور محبت میں خود سے بے خبری پر محمول کیا۔ یعنی ...ضور صلی اللہ علیہ وسلم وفور محبت الٰہی میں اس قدر مستغرق تھے کہ آپ کو اپنی ذات تک ... خبر نہ تھی۔

تاریخی تناظر میں بھی یہی حق و صواب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے ...یس چالیس روز تک غار حرا کی تنہائیوں میں یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ ختمی ...بتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی عشق الٰہی میں استغراق و محویت کی اسی کیفیت کو ترجمے کے

قالب میں ڈھالتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ فرمایا۔

"اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی"

یعنی اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم جب تیری محبت و محویت اس کمال تک پہنچ گئی کہ تجھے نہ اپنی خبر رہی نہ دنیا و مافیہا کی یعنی جب تیرا استغراق و انہماک اپنے نقطہء عروج کو چھونے لگا تو "فھدی" ہم نے تمام حجابات مرتفع کر دیئے تمام پردے اٹھا دیئے۔ تمام دوریاں مٹا دیں۔ تمام فاصلے سمیٹ دیئے اور اپنی بارگاہ صمدیت میں مقام محبوبیت پر فائز کر دیا۔ اعلیٰ حضرتؒ نے محب و محبوب کے مابین چاہت و محبت کے کیفیات اور کمال درجہ احوال و دلربائی کا لحاظ کرتے ہوئے اس انداز سے ترجمہ کیا کہ لغت و ادب کے تقاضے بھی پورے ہو گئے اور بارگہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پایا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

وما علینا الاالبلاغ